ڈاکٹر جمیل جالبی: اُردو زبان وادب کا محسن

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

عظمیٰ نورین
پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی ویمن یونیورسٹی،
سیالکوٹ، پاکستان

ABSTRACT

"Real name was Muhammad Jamil Khan and who to his name as he was impressed by ''Jalbi''later on added the famous Journalist Syed Jalib Dehlvi.Dr Jamil Jalbi was in Uterperdaish, Aligarh,and died at the 1929ء born in June years in Karachi.age of about 90 primary and secondary education from He received from Meerath and migrated to Aligarh,did his F.A,B.A Bahadur Yar ''1947.He was headmaster atءPakistan in improving education school Karachi.He continued ''Jung from Sindh English,Urdu,and L.L.Bpassing M.Aafter University Jamshoro.He obtained Doctorate Degree from Thesis on the PHD Jamshorou Sindh university and wrote Ghulam "in supervision of Dr قدیم اُردو ادب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ title of " Mustafa Khan.He was awarded D_Lit Degree on the subject

edited very first time on the subject "as he مثنوی کدم راؤ پدم راؤ of "
served in Incom Tax exams and above.He qualified CSP
department.After retirement he passioned for urdu literature
development.He wrote urdu,English dictionary comprising of
words.He became Vice Chancellor of Karachi 2,50,000
University.He became president of Muqtadra Qaumi Zaban
books.The books written by about 38wrote at Islam Abad.He
him contain research,criticism,editing,translation,dictionary
history from traced and urdu literature of children.He
wrote years.Dr jamil Jalbi comprising 2500 Aristotle till Elite
on the history of urdu literature contained four volums which
history from trekked was not possible for one person.Jalbi
years as he was impressed by the last 200

"بابائے اُردو مولوی عبدالحق"

Imtiaz and -e-Imtiaz, Sitar -e-He was awarded Hilal
e fun award. The urdu literature must be proud of -Kamal
.''his services renderd for the development of urdu literature

تاریخ شاہد ہے کہ کچھ شخصیات عہد ساز ہوتی ہیں۔اور بلاشبہ قدرت کا خاص انعام و اکرام ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص بندوں کو خاص مناصب کے لیے منتخب کر لیتا ہے اور انہیں خصوصیات وصفات اور اپنی خداداصلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے کارنامہ ہائے سرانجام دیتے ہیں کہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ایک ایسی ہی عہد ساز شخصیت اُردو زبان وادب کی شان، آن، ایک معتبر نام اور مستند حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نامور محقق، نقاد، ماہر لسانیات ،ادبی مؤرخ اور مترجم کی حیثیت سے منفرد پہچان اور مقام و مرتبہ کے حامل تھے۔آپ کا نام علمی و ادبی

حلقوں میں دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مثبت انداز میں نام روشن کرنا ہی اصل کامیابی و کامرانی ہے۔کوئی بھی قدآور شخصیت مال و دولت یا رعب و دبدبے کے بل بوتے پر اوراق تاریخ اور لوحِ دل میں جاگزیں نہیں ہوتی بلکہ اصل دولت عاجزی اور انکسار ہے۔کسی نے مجبور و بے کس اور بے بسوں کے لئے راہیں آسان کیں تو کسی نے قلمی جہاد کیا۔اور قلم کے ذریعے ادب کی خدمت کی۔سوال یہ ہے کہ ادب سے کیا مراد ہے؟ اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ ادب دراصل انسان کے دل و دماغ پر خارجی موجودات کے نقوش و اثرات اور خیالات کی صورت میں پیدا ہونے والے اثرات و تاثرات کی روداد ہے۔ادب جذبات، احساسات اور خیالات کے موزوں اظہار کا نام ہے۔اُردو زبان پر مشتمل ادب اُردو ادب کہلاتا ہے جو نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ نثری اصناف میں داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، آپ بیتی، سوانح، انشائیہ، مکتوب نگاری اور سفرنامہ شامل ہیں۔ جب کہ شاعری میں قصیدہ ،غزل، نظم، رباعی، مرثیہ اور مثنوی شعروسخن کی مثالیں ہیں۔ادب برائے ادب میں کسی سیاسی اور سماجی مسئلے کو موضوع نہیں بنایا جاتا بلکہ اصل مقصد ذہنی آسودگی اور تسکین ہوتا ہے جب کہ ادب برائے زندگی میں مسائل حیات کو اُجاگر کرتے ہوئے ادب سے زندگی کا حسن سنوارنے اور بہتر زندگی کا لائحہ عمل پیش کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ادب برائے ادب کا تصور فرانس میں مقبول و عام ہوا اور ادب برائے زندگی کا نظریہ علمی تحریک جسے تحریک علی گڑھ اور تحریک سرسید بھی کہا جاتا ہے، کے زیر اثر رائج پایا۔اُردو میں ادب عالیہ اُس ادب کو کہا جاتا ہے جو عظمت اور ترفع کے اس اعلیٰ معیار پر ہو جسے دوسری زبانوں کے ادب کے برابر رکھا جا سکے۔اسی طرح ادب لطیف کا مقصد نشاط انگیزی اور حصول مسرت ہے۔یوں ہم ادب کو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہوئے اپنی سمت متعین کرتے ہیں۔اُردو ادب میں نثری ادب بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ شعری ادب، لیکن غزل اور نظم سے ہی اُردو ادب کی شان میں اضافہ ہوا ہے۔اُردو ادب پاکستان میں مقبول اور بھارت میں مشہور ہے جب کہ دنیا بھر کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی سمجھا اور پڑھا جاتا ہے۔ادب کی اصطلاحی تعریف میں علماء کی مختلف آرا ملتی ہیں۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی کے بقول:

"ادب ایک ایسا ملکہ ہے کہ جس کے ساتھ قائم ہوتا ہے ہر ناشائستہ

بات سے اس کو بچاتا ہے۔"

ابوزید انصاری نے ادب کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"ادب ایک ایسی اچھی ریاضت ہے جس کی وجہ سے
انسان بہتر اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔"

ابن الاکفانی کے نزدیک:

"علم ادب ایسا علم ہے جس کے ذریعے سے الفاظ اور کتابت کے ذریعے
اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔اور اس کا موضوع لفظ
اور خط ہے۔اس کا فائدہ مافی الضمیر کا اظہار ہے۔"

قیام پاکستان کے بعد ادب کے حوالے سے فکری، تاریخی، ثقافتی اور نظریاتی اساس کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ آزادی کے بعد سست اور آہستہ ضرور رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا پودا دھیرے دھیرے نشوونما پاتا رہا۔ پاکستانی ادب کی کئی تعریفات کی گئی ہیں۔ جو بہت حد تک پاکستانی ادب کی ماہیت اور اس کے خدوخال کو بیان کر دیتی ہیں۔ان تعریفات سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔مگر ان میں سچائی کا عنصر بہر حال نمایاں ہے۔

فیض احمد فیض کا موقف ہے:

"پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستانی روایات، حالات، پس منظر اور
پیش منظر سے مطابقت موجود ہو۔اس میں مقامیت کے مقاصد کے
ساتھ آفاقیت بھی موجود ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

"پاکستانی ادب سے مراد وہ ادب جو پاکستان کے وجود، پاکستان
کے وقار اور پاکستان کے طریقے کا اثبات کرتا ہو اور جو پاکستان
کے تہذیبی و تاریخی مظاہر کا ترجمان ہو اور جو یہاں کے کروڑوں
باشندوں کی امنگوں اور آرزوؤں نیز شکستوں اور محرومیوں کا غیر
جانبدار عکاس ہو۔ظاہر ہے اس صورت میں پاکستانی ادب، ہندوستانی
یا ایرانی، چینی یا انگریزی ادب سے مختلف ہوگا۔"

مرزاادیب کا خیال ہے:

"وہ ادب جو پاکستان میں رہنے والے ادیبوں نے وجود پذیر کیا ہے۔
پاکستانی ادب ہی کہلائے گا۔"

ڈاکٹر سلیم اختر پاکستانی ادب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"پاکستانی ادب کا لکھا ہوا وہ ادب جس میں پاکستانی قوم کے مسائل وابتلا
کا تذکرہ ہو یا جس سے پاکستانی قوم کا تشخص اُجاگر ہوتا ہو،
اسے پاکستانی ادب قرار دیا جاسکتا ہے۔"

پاکستان میں اُردو زبان وادب کے میدان میں قلمی جہاد کا فرض منصبی سرانجام دینے والی معتبر ادبی شخصیت ڈاکٹر جمیل جالبی جون 1929ء کو علی گڑھ، برطانوی ہندوستان میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

"سرکاری ریکارڈ میں جمیل جالبی کی تاریخ ولادت یکم جولائی 1929ء
ہے لیکن ان کی پیدائش کی اصل تاریخ 12 جون 1929ء ہے۔
جالبی علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔"(1)

اصل نام محمد جمیل خان ہے۔ اور آپ کا مکمل نام محمد جمیل خان بن محمد ابراہیم خان بن محمد اسماعیل خان ہے۔ جب کہ قلمی نام جمیل جالبی اور بعد ازاں ڈاکٹر جمیل جالبی کہلائے۔

"جس زمانے میں جالبی صاحب فرسٹ ائیر کے طالب علم تھے۔ تو انہوں نے اپنا نام جمیل جالبی کر لیا، نام کے ساتھ جالبی کا لاحقہ اس لیے لگایا کہ اُردو ادب کے صف اول کے صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی کے دادا، دونوں ہم زلف بھی تھے۔ اور رشتے کے بھائی بھی تھے۔ ان کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے گھر میں ان کا اکثر ذکر رہتا۔ محمد جمیل خان نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ان کا آئیڈیل سید جالب دہلوی تھے۔ اس لیے جالب کی رعائیت سے انہوں نے نام کے ساتھ جالبی لگا لیا۔"(2)

آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق یوسف زئی پٹھان قبیلیسے تھا۔ اور اٹھارویں صدی میں سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے والد محمد ابراہیم خان میرٹھ میں پیدا ہوئے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ میٹرک 1943ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سے پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے 1945ء میں ایف-اے اور 1947ء میں بی-اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے تعلیمی ماحول میں جالبی صاحب کو ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر غیور احمد رزمی، پروفیسر کرار حسین جیسے اساتذہ ملے۔ جنہوں نے ان کی ادبی صلاحتیوں کو نکھارا۔ قیام پاکستان کے بعد 1947ء میں جمیل جالبی والدین کو بنا بتائے پاکستان آ گئے۔ ابتدائی ایام کراچی میں گزارے۔ بعدازاں ان کے بھائی عقیل بھی پاکستان آ گئے۔ اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں ان کے والد ہندوستان سے ان دونوں بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم بھیجتے رہے۔ ابتدا میں کراچی کے ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹری کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے پیغمبری پیشے میں اپنے فرائض سرانجام دینے لگے۔ معلّمی کے ساتھ ساتھ علمی تشنگی کو بجھانے کا بندوبست بھی کرنے لگے۔ اور جوئندگان علم کے متلاشی جمیل جالبی صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ایم-اے انگریزی، ایم-اے اُردو اور ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ 1981ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے پی ایچ ڈی کا مقالہ "قدیم اردو ادب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر مصطفیٰ خان کی نگرانی میں مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1983ء میں جامعہ ہذا سے ہی اردو ادب کی پہلی مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ" کی تدوین پر ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا گیا۔

گھریلو تعلیم وتربیت کے علاوہ جمیل جالبی کی تعلیم وتربیت میں جن اساتذہ کرام نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ولی محمد خان شعلہ، مولوی محمد اسماعیل اور مولوی فیض الحسن کیساتھ ساتھ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر کرار حسین، پروفیسر غیور احمد رزمی صدیقی، پروفیسر مظہری پروفیسر محمد حسن عسکری، پروفیسر بسواس، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر ماتھر اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر خاص طور پر شامل ہیں۔ ان اساتذہ نے آپ کے علمی وادبی ذوق کو اُبھارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد سول سروسز (سی ایس ایس) کا امتحان پاس کر کے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دینے لگے۔ اور انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد باقاعدہ طور پر زبان وادب کی خدمت پر مامور ہوئے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ جالبی صاحب کو اردو زبان وادب سے شغف نہیں عشق رہا ہے۔ جس کا ثبوت یکم ستمبر 1983ء سے 31 اگست 1987ء تک جامعہ کراچی میں بحیثیت چانسلر تعیناتی ہے۔ اردو ادب

کے فروغ کا ایک اہم ادارہ مقتدرہ قومی زبان (موجودہ نام ادارہ فروغ قومی زبان) میں بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

17 نومبر 1987ء سے 1994ء تک مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔(4)

1991ء سے 1998ء تک اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے اعزازی صدر رہے۔(5)

1953ئمیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی شادی ان کی خالہ زاد نسیم شاہین سے ہوئی۔ دو بیٹے ڈاکٹر خاور جمیل (خاور جمیل بھی اپنے والد کی طرح علمی و ادبی ذوق رکھنے والی شخصیت ہے) اور محمد علی خان، دو بیٹیاں سمیرا جمیل اور فرح جمیل ہیں۔ جالبی صاحب کی سب سے پہلی تخلیق "سکندر اور ڈاکو" تھی۔ جو انہوں نے بارہ سالہ کم سنی میں تحریر کی۔ مذکورہ کہانی بطور ڈراما اسکول میں اسٹیج کیا گیا۔ اپنے ایک انٹرویو میں جمیل جالبی صاحب نے اپنی اولین تخلیقی سرگرمی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا:

> "میں نے سب سے پہلے نویں جماعت میں ایک چھوٹا سا ڈراما لکھا تھا۔ اس کے بعد بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا رہا۔ جب کالج میں پہنچا تو افسانے لکھنے شروع کیے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی منٹو کے انداز میں اور کبھی عصمت چغتائی اور حسن عسکری کے رنگ میں۔"(6)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا سب سے پہلا تنقیدی مضمون "نئے شاعر فیض احمد فیض" اگست 1968ء میں "نیا دور" کراچی سے شائع ہوا۔ لکھتے ہیں:

> "1967ء میں جب سہارن پور میں ہندو مسلم فساد ہو رہا تھا۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ اور ہم سب گھروں میں قید تھے تو اس وقت میرے پاس چند کتابیں تھیں۔ ان میں فیض کی "نقش فریادی" بھی تھی۔ نقش فریادی اس زمانے میں میرا پسندیدہ مجموعہ تھا۔ میں اسے پڑھتا رہتا اور لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اسے پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا تنقیدی مضمون تھا۔ جو میں نے لکھا جب کراچی آیا تو یہ مسودہ میرے ساتھ تھا۔ محمد شاہین صاحب کو دے دیا جسے انہوں نے نیا

دور میں شائع کیا۔"(7)

جارج آرول کے ناول کا ترجمہ جمیل جالبی نے "جانورستان" The Animal Form کے نام سے کیا۔ جو 1958ء میں شائع ہوا۔ ان کی سب سے پہلی مرتب کردہ کتاب منشی سجاد حسین کی "حاجی بغلول" تھی۔ جو کہ 1961ء میں منظر عام پر آئی۔ پہلی طبع زاد کتاب جو کہ بہت اہم اور شہرت کی حامل سمجھی جاتی ہے اس کا نام "پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ" تھی۔ جو پہلی مرتبہ 1964ء میں شائع ہوئی۔ اور اب تک اس کے تقریباً آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1969ء میں کراچی سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ "پیام مشرق" سے نائب مدیر کی حیثیت سے چھ ماہ تک منسلک رہے۔ بعد ازاں 1950ء سے 1956ء تک "ساقی" کی مجلس صدارت میں شامل رہے۔ آپ نے مذکورہ رسالے میں "باتیں" کے عنوان سے ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ 1955ء میں اپنا رسالہ "نیا دور" نکالا۔ جو مختصر وقت میں آپ کی خاص ادبی شناخت کا سرخیل ثابت ہوا۔ اس رسالے میں آپ نے ن-م راشد کے حوالے سے پہلی اشاعت کا اہتمام کیا جسے بعد میں کتابی صورت میں "ن-م راشد ایک مطالعہ" کے عنوان سے شائع کر دیا گیا۔ جالبی صاحب کی مدیرانہ خدمات کے حوالے سے نذر الحسن صدیقی رقم طراز ہیں:

"1955ء میں لاہور میں ایک نیا ادبی جریدہ خریدا تھا۔ جس کے دیدہ زیب ٹائٹل اعلیٰ پائے کے ادبی و شعری معیار اور اچھوتے انداز نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہ "نیا دور" کا پہلا شمارہ تھا۔ صفحہ ادارت پر شمیم احمد اور شاہد قمر سلطانہ کا نام چھپتا تھا مگر جب 1957ء میں مستقل طور پر کراچی آ گیا تو میاں بھائی کے ذریعے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ نیا دور جمیل جالبی کا پرچہ ہے۔ اور اپنے پرچے میں چھپنے والی سطر سطر پہلے ان کی نظر سے گزرتی ہے۔ آنے والے بعد کے سالوں میں خود مجھے بھی ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہو گیا اور صدیقی صاحب کی بات کی تصدیق ہو گئی۔"(8)

ایک اور جگہ تحریری معیار کو پرکھتے ہوئے ڈاکٹر مشرف یوں رائے زنی کرتے ہیں:

"نیا دور" اردو کا غالباً واحد ادبی رسالہ ہے جس کے اصل مدیر کا نام کبھی اس پر لکھا نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کے باوجود تمام اہل قلم جانتے تھے کہ اس پردہ نگاری کے پیچھے کون ہے۔؟"(9)

بلاشبہ عمیق، ژرف نگاہ اور صاحب بصیرت ڈاکٹر جمیل جالبی حیات زیست کا ایک عہد اردو زبان وادب کی آبیاری میں گزار چکے ہیں۔ قطع نظر ادبی خدمات کے ظاہری اور باطنی حلیے پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں کہ قاری کو لفظی تصویر کشی سے جالبی کے خدوخال سے بھی شناسائی ہو جائے کہ کس قسم کی شخصیت تھے۔ جمیل جالبی کے حلیے کے حوالے سے ان کے قریبی دوست شاہد احمد دہلوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے ریشمیں سے نوجوان سامنے آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھیں، کتا راسی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخداں، ڈاڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیروانی، اکھرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید جوتی۔"(10)

جالبی کے اخلاق وخصائل کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے انور عالم صدیقی اپنے مضمون "میرا ہم جماعت" میں لکھتے ہیں:

"جمیل دل کا صاف، زبان کا کھرا اور صاف گو انسان ہے۔ کسی کو دھوکا نہیں دے گا کسی سے دشمنی نہیں نکالے گا، کسی سے بدلہ یا انتقام نہیں لے گا، معاف کرنا اس کا مسلک ہے۔ کوئی اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ بھول جاتا ہے۔ وہ کھلے دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں کرتا، تعصب اس کے مزاج میں بالکل بھی نہیں ہے۔ ضرورت مند کوئی ہو، کہیں کا ہو، وہ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بہت سے طالب علم ایسے ہیں جنہیں جمیل جالبی نے اپنے خرچ سے تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔"(11)

بیگم نسیم شاہین اپنے مضمون "ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں" میں لکھتی ہیں:

"لکھتے ہوئے بار بار چائے پیتے ہیں اور یہی حال کھانے کا ہے، سگریٹ وغیرہ کے بالکل شوقین نہیں ہیں کھانے میں گوشت بہت پسند کرتے ہیں۔ اور سویٹ ڈش بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ کرتا اور شیروانی اور چپل پہننا انہیں اچھا لگتا ہے۔ ان کی پسند رنگوں کے معاملے میں بدلتی رہتی ہے۔ پھولوں اور خوشبو سے بھی بہت پیار ہے اور پھولوں میں گلاب کا پھول بہت پسند ہے۔"(12)

محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اظہار رائے کرتے ہوئے جمیل جالبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر جمیل جالبی ہمارے عہد کی قد آور شخصیتوں میں سے ہے۔ان کے مزاج میں سنجیدگی اور شگفتگی کے عناصر برابر ہیں۔غالباً سنجیدگی علمی کاموں کیحوالے سے اور شگفتگی ادبی کاموں کے حوالے سےان میں پختہ جگہ پا گئی۔"(13)

ان آراء کی روشنی میں ڈاکٹر جمیل جالبی ظاہری و باطنی عادات، اخلاق و خصائل میں ایک نہایت نفیس اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔جالبی صاحب نے کم وبیش 38 کتابیں تصنیف کی۔ان کی درجہ بندی کچھ یوں ہے۔

تنقید:

تنقید میں پاکستانی کلچر:" قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ "،" تنقید اور تجربہ "،" محمد تقی میر "،" نئی تنقید (مرتبہ: خاور جمیل)"،" ادب کلچر اور مسائل (مرتبہ: خاور جمیل)"،" قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل"،" معاصر ادب"۔

ادبی تحقیق:

تنقید کے بعد تحقیق و تدوین کے حوالے سے حاجی بغلول (منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول)، "دیوان حسن شوقی"،" دیوان نصرتی"،مثنوی نظامی دکنی المعروف " کدم راؤ پدم راؤ"،" بزم خوش نفساں "(شاہد احمد دہلوی کے 116 خاکوں کا مجموعہ)،"ن-م راشد:ایک مطالعہ "،" کلیات میراجی "،" میرا جی:ایک مطالعہ "فن پارے ادب کی زینت بنے۔چونکہ جالبی صاحب کراچی اردو لغت بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔انہوں نے فن لغت نویسی میں بھی کمال جوہر دکھائے اور " قدیم اردو لغت"، "فرہنگ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ (اول جلد)"،" فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد دوم)"،" قومی انگریزی اردو لغت "۔بحیثیت ادبی مؤرخ جمیل جالبی نے " تاریخ ادب اردو" کی چار ضخیم جلدیں تصنیف کر کے لکھی گئی تمام تواریخ سے منفرد مقام و مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو کر اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ثابت ہوئے

"تاریخ ادب اردو" کی کتب کی درجہ بندی جالبی صاحب نے کچھ یوں کی ہے:

1۔تاریخ ادب اردو: قدیم دور، آغاز سے 1705ء تک (جلد اول)۔

2۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ اول)۔

3۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)۔

4۔تاریخ ادب اردو (جلد سوم)۔

5۔تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)۔

آغاز سے تا حال اردو زبان وادب کی تاریخ رقم کرنا فرد واحد کے بس کی بات نہ تھی لیکن جالبی صاحب کی محنت، ریاضت اور علمی وادبی شغف لائق تحسین ہے۔اور ایک یہی ادبی کام انہیں تا ابد تاریخ کے اوراق میں زندہ رکھنے کو کافی ہے۔جمیل جالبی کی ایک پہچان بطور مترجم بھی ہے

۔انہوں نے درج ذیل تراجم کیے۔

1-جانورستان (جارج آرول کی کتاب "دی اینمل فارم" کا ترجمہ)

2۔ایلیٹ کے مضامین۔

3۔ارسطو سے ایلیٹ تک۔

4۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ)

Islamic Modernism in india and Pakistan

(1857ء-1964ء)

5۔برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ)

Islamic culture in Indian Environment.

اور دیگر تصانیف میں بچوں کے لیے قصے کہانیاں، حیرت ناک کہانیاں لکھیں۔ایاز قادری نے سندھی زبان میں مذکورہ کتاب کا ترجمہ "حیرت ناک کہانیوں" کے نام سے کیا۔پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ، ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔سرشار کے مزاحیہ کردار خوجی کی سرگزشت پر مبنی کہانی "نہ ہوئی قرولی" کے عنوان سے لکھی۔جو ماہ نامہ "ہونہار" کراچی میں کامل القادری کے باہمی اشتراک سے قسط وار شائع ہوتی رہی۔پاکستانی کلچر بہ اشتراک ایم ایچ صدیقی شائع ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک ہمہ جہت اور کثیر الصلاحیت نابغہ روزگار تھے۔ایک مؤرخ کے نزدیک ادبی تاریخ کسی بھی عہد کے ادب کے ارتقائی سفر کی روداد اور دستاویز ہے۔ادب دراصل انسان کی

خواہشات،فکری رویوں،رنج والم،انبساط اور خیالات وتخلیقات کا عکاس گردانا جاتا ہے۔جب کہ تاریخ مذکورہ تمام لوازمات وتلازمات کو سیاسی،معاشرتی واقتصادی،جغرافیائی صورت حال اور مذہبی عناصر کے زیر اثر دیکھنے اور پرکھنے کا عمل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک تاریخ ادب کی تعریف کچھ یوں ہے:

"ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں اس زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ادب میں سارے فکری،تہذیبی،سیاسی،معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہوکر ایک وحدت ایک اکائی بنائے۔اور تاریخ ادب ان سارے اثرات و روایات،محرکات اور خیالات ورجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔"(14)

اس طرح ایڈسن لکھتا ہے:

''It is a chronological account of the men who wrote in these languages and the books they produced, with critical analysis of their merits and defects and some description of literary schools and traditions and of fluctuation in fashions and taste.''(15)

جالبی صاحب وسیع المطالعہ تھے۔انہیں تاریخ کا گہرا شعور تھا۔تاریخ کے اصول پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاریخ کا کام صرف یہ نہیں کہ واقعات وحقائق کا محض اندراج کردے۔بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کہ ایک ایسی تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہوجائے اور ادب کا حقیقی،تاریخی ارتقاء بھی نظروں کے سامنے آجائے۔"(16)

یعنی تاریخ کے بیان میں ایک ربط،تسلسل اور تنظم ہونی چاہیئے تاکہ تاریخ ماضی بن جائے اور گزرے کل کی صورت میں عیاں ہوجائے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ایک ادبی محقق کا کام ماضی کے ذخائر کو دریافت کرنا ہے۔حقائق واقعات اور سوانحات کی صحت کو جانچنا ہے۔ماضی کے تسامحات کو دور کرنا ہے اور مختلف افراد سے منسوب غلط روایت کی تردید کرنا

اور تحقیقی کام میں درست حقائق کو سامنے لانا ہے۔"(17)

درج بالا رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے مصنف کی ذمہ داری بہت حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ قدیم ادبی متون کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف صحت، کتابت اور سند کا بھی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اگر تاریخ نویسی کے دوران میں واقعات کی صحت و تنظیم کا خیال ملحوظ خاطر نہ ہو تو ایسی تاریخ قابل قدر کسی صورت نہیں سمجھی جاتی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک کہنہ مشق مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ قاری بھی ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے چہار سو عمیق گہرائی سے گیرائی کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کی کم و بیش تمام جہتوں میں قلمی جوہر دکھاتے ہوئے ادبی سرمایہ میں ناقابل فراموش اضافہ کیا ہے۔ جالبی صاحب تاریخ نویسی کے فن سے شناسا ہوئے۔ اصول وضوابط متعین کیے۔ ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ادوار اور اصناف سے متعلق کس حد تک معلومات ہونی چاہیئے۔ جس سے مصنف استفادہ کر سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل وتعمیر اور ردعمل وتبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا جائے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آجائیں۔"(18)

جالبی صاحب نے ان تمام امور کی نہ صرف نشاندہی کی جن سے ایک مؤرخ کو تاریخ نویسی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بلکہ انہوں نے "تاریخ ادب اردو" کی چار جلدیں لکھ کر اس کا عملی مظاہرہ کر دکھایا۔ تحقیق کی دنیا میں ایک اہم نام ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ نویسی کے فن کے حوالے سے لکھا ہے۔

"ادبی تاریخ کے ابتدائی دور میں جہاں مختلف ادوار کی لسانی خصوصیات شمار کرانے کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں تحقیقی پہلو کے علاوہ تخلیقات کا تاریخی تہذیبی پس منظر میں بھی مطالعہ کیا گیا۔ اور سب سے زیادہ ادب اور کلچر کے باہمی ردعمل پر زور دیا گیا۔ آب حیات سے رام بابو سکسینہ کی تاریخ تک ارتقاء کی ایک بڑی جیت ہے اور رام بابو سکسینہ سے جمیل جالبی تک دوسری، جنہوں نے ادوار کی بجائے روایات کا دامن پکڑ کر تاریخ کا بیان کیا۔"(19)

جالبی صاحب ادب اور سماج کے باہمی تعلق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ادب کو جہاں معاشرے اور تہذیب کا عکاس اور ترجمان قرار دیتے ہیں۔ وہاں تاریخ نویسی میں تحقیق کی اہمیت پر بھی زور دیتے

دکھائی دیتے ہیں۔ان کے مطابق تحقیق کے بغیر تاریخ اور تاریخ ادب کی چنداں اہمیت نہیں۔آپ تحقیق اور تنقیدی شعور کی دولت سے مالا مال تھے۔ جو کسی بھی ادیب کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین کی امتیازی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اول جولائی 1975ء میں پہلی مرتبہ سامنے آئی۔ جلد اول اردو زبان وادب کے آغاز سے لے کر 1975ء تک کے دور کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ یہ چھ فصلوں پر محیط ہیہر فصل میں ابواب کی تعداد مختلف ہے۔ جالبی صاحب نے آغاز حسب روایت تمہید سے کرتے ہوئے اردو زبان کی ابتداء اور نشو ونما کے حوالے سے مختلف نظریات اور زبان کے پھیلاؤ میں سماجی اور سیاسی عوامل بیان کیے ہیں۔ بقول جمیل جالبی:

"پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانیسنوارنے میں حصہ لیا۔ وہ زبان وہ جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی۔اس کی ساخت اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔"(جلد اول ص 22)

اس بارے میں جالبی نے قدیم اردو ادب کا گہرا تاریخی حوالے سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان "بابر سے شاہجہان" تک ہے جو 1525ء سے 1657ء تک کے دور پر مشتمل تقریباً سوا سو سال کے ان سیاسی، تہذیبی، سماجی اور لسانی اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جو اردو زبان وادب کے ارتقاء پر اثر انداز ہوا ہے۔ جالبی صاحب نے محقق کے ساتھ ساتھ مدون کے فرائض بھی نبھائے ہیں۔

تدوین عربی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی زبان میں تدوین کے معنی گرد آوردن، فراہم آوردن، تالیف کردن، تالیف درج ہیں۔

"فرہنگ عامرہ میں تدوین کے جو معانی دیے گئے ہیں ان میں جمع کرنا، تالیف کرنا شامل ہیں۔"(19)

اردو لغت میں تدوین کے معنی جمع و ترتیب، تالیف اور تحریر کے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:

"اردو میں تدوین متن کی حد تک ہم متن اس تحریر کو کہہ سکتے ہیں جسے کوئی محقق ترتیب دینا چاہتا

ہے۔ وہ تخلیق، نظم و نثر ہو یا غیر تخلیقی تذکرہ یا انشا کی دریائے لطافت یا گل کرسٹ کا رسالہ، قواعد وغیرہ۔ تدوین متن مختلف نسخوں، شاذ وحید نسخے کا مطالعہ کر کے مصنف کے اصل متن کی باز تشکیل کرنے کو کہتے ہیں۔"(20)

تدوین دراصل تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے تدوین متن کے لیے مدون کے لیے لازم ہے کہ وہ تحقیقی وتنقیدی شعور سے کام لیتے ہوئے متن کو ترتیب دے۔ تدوین متن اور ترتیب متن کا تعلق گیان چند جین کی رائے کی روشنی میں لکھتے ہیں:

"اردو میں تدوین متن سے زیادہ مقبول اصطلاح ترتیب متن ہے۔ دونوں قریب المعنی ہیں۔ ترتیب کے معنی کسی شے کے اجزاء کو مناسب تقویم وتاخیر سے رکھنا ہے۔ تدوین کے معنی متفرق اجزا کو اکھٹا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرنا ہے۔ شعراء کے مجموعہ کلام کو اسی لیے دیوان کہا گیا کہ ان میں غزلیں اور نظمیں جمع کی جاتی ہیں۔ ترتیب ایک عام لفظ ہے اور تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے۔ اس لیے اس اصطلاح کو ترجیح ہے۔"(20)

یعنی تدوین متن سادہ الفاظ میں متفرق اجزا کو ایک جگہ براہ راست یکجا کر دینا ہے جب کہ ترتیب متن میں مدون اپنی مرضی سے تقویم وتاخیر اور ترتیب میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جب تاریخ ادب اردو جلد اول تحریر کی تو اس دوران انہیں قدیم فنون سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابتدائی شعری سرمایہ دستیاب ہوا اور پھر ابتدائی دور کے حوالے سے خاص طور پر دکنی ادب کے دیوان دستیاب ہوئے تو انہوں نے اس قدیم عہد کے تین اہم شعرائے ملک کے دواوین کی تدوین کی ان شعراء کے نام یہ ہے۔ حسن شوقی، نصرتی اور نظامی۔

"دیوان حسن شوقی 1971ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے مولوی عبدالحق نے 1929ء میں حسن شوقی کی دو مثنویات اور تین غزلیں شائع کیں۔"(20)

سخاوت مرزا نے 1956ء میں مزید تین غزلیں اور 1945ء میں حسینی شاہ پانچ غزلیں تلاش کر کے منظر عام پر لائے۔ حسن شوقی کے اس کلام کی دریافت کی اور مزید اضافہ کرتے ہوئے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"قدیم ادب کا اس سے بڑا خزانہ پاکستان میں نہیں ہے اور بہت سے مخطوطات ایسے ہیں جن

کی اشاعت اردو ادب کی بنیادی ترقی اور ادبی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے کے لیے ضروری ہے۔ دیوان حسن شوقی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں فتح نامہ نظام شاہ، میز بانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ کے علاوہ تین غزلیں، جو قدیم بیاضوں میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، شامل ہیں۔ چند غزلوں کو چھوڑ کر باقی سب چیزیں پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔"(21)

مختلف بیاضوں سے حسن شوقی کا کلام مجتمع کر کے جس انداز میں جالبی نے اپنے علمی مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے تو آپ کا طریق تحقیق و تدوین واضح ہو جاتا ہے۔ تدوین متن کے حوالے سے جالبی صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ " دیوان نصرتی" کی ترتیب و تدوین ہے جو "دیوان حسن شوقی" کی اشاعت کے دوسرے ہی سال 1982ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ باقاعدہ اشاعت سے قبل اسے سہ ماہی صحیفہ لاہور سے 1972ء میں شائع کیا گیا۔ بعد ازاں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ نصرتی کے اس دیوان میں 23 غزلیں، 28 رباعیاں، 3 قطعے، 2 مخمس، ایک ہجو 550 اشعار کی ایک مثنوی جسے "تاریخ اسکندری" کہا جاتا ہیاور ایک قصیدہ شامل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

" نصرتی کی تین تصانیف یادگار ہیں۔ ایک گلشن عشق (1068ء) دوسری علی نامہ (1076ء) اور تیسری دیوان نصرتی جس میں تاریخ سکندری یعنی فتح نامہ بہلول (1083ء) شامل ہیں۔"(22)

بہمنی دور کا پہلا شاعر فخر الدین نظامی اپنے عہد کا ایک باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ جالبی ایک محقق تھے انہوں نے داخلی شواہد کی بنا پر مثنوی " کدم راؤ پدم راؤ" کے مصنف کا نام فخر الدین کی بجائے فخر دین تحریر کیا ہے۔ بقول جالبی:

" کدم راؤ پدم راؤ میں فارسی، عربی کے اثرات، لہجہ میں، اسلوب میں، ذخیرہ الفاظ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں صرف سوا سو الفاظ فارسی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے الفاظ بگڑی ہوئے شکل میں آئے ہیں۔"(23)

مثنوی کی زبان گو کہ اردو کے قریب ترین ہے لیکن جالبی نے اس پر پنجابی، گجراتی، مرہٹی، سرائیکی اور سندھی زبان کے اثرات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہ اردو زبان کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔ یہ

اردو زبان کا قدیم ترین ادبی اور لسانی نمونہ ہے۔ مذکورہ مثنوی اردو زبان کے قدیم دکنی لہجے میں لکھی گئی۔ اس کا قصہ تبدیلی قالب سے متعلق ہے۔ یہ تصور دراصل عقیدہ "تناسخ" سے جڑا ہوا ہے۔ راجہ کدم راؤ جب اکھر ناتھ یوگی سے اپنی روح کو دوسرے کے مردہ جسم میں منتقل کرنے کا منتر سیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے بہت سی مشکلات، پریشانیوں اور مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں قدیم ہندوانہ عقیدے اور توہم پرستی کو بھی قصے کا جزو بنایا گیا ہے۔ مثنوی کے مرتب جمیل جالبی نے مثنوی کا تعارف و تجزیہ کرتے ہوئے مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

آزاد نظم کے بانیوں میں شمار ہونے والے ثنا اللہ ڈار عرف میراجی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے انہوں نے میراجی کے مطبوعہ و غیرہ مطبوعہ کلام کو یکجا کیا اور " کلیات میراجی" انہی کاوشوں کی اک کڑی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

" کلیات میراجی کی اشاعت سے پہلے میراجی کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں (1)۔ میراجی کی نظمیں 1966ء، (2)۔ میراجی کے گیت 1963ء، (3) گیت ہی گیت 1966ء، (4)۔ تین رنگ 1967ء، پابند نظمیں 1928ء۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ نظمیں "نیا دور" کراچی میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ عام رائے یہ تھی کہ ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام اختر الایمان کے ہاں محفوظ ہے۔ اختر الایمان بھی اسے ایک مجموعے کی صورت میں مرتب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ جمیل جالبی نے " کلیات میراجی" میں نہ صرف ان کے مطبوعہ کلام کو شامل کیا بلکہ اختر الایمان اور میراجی کے دوسرے دوستوں سے بھی جو کچھ دستیاب ہو سکا اسے ایک جگہ جمع کر دیا۔"(24)

" کلیات میراجی" کے حوالے سے جالبی صاحب کی کاوش بسلسلہ تحقیق نو آموز محققین کیلئے بہت سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ نے " کلیات میراجی " کی تدوین کے مراحل میں تدوین متن کے تمام تقاضوں کو بااحسن طریق نبھایا ہے۔ نہ صرف کلام کو یکجا کیا بلکہ ایک تنقیدی مقدمہ لکھ کر قاری کے ذہن کو وسعت بھی بخشی ہے۔ اور ان کی شاعری پر جو ابہام کے الزام لگتے رہے ہیں انہیں بڑی حد تک دور کرنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ مختلف تنقیدی مضامین کو یکجا کر کے "ن-م راشد: ایک مطالعہ " کے نام سے کتاب مرتب کی جو آنے والے محققین اور ناقدین کے لیے نایاب تحفہ ہے۔ اسی طرح "میراجی: ایک مطالعہ " کے نام سے بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب مرتب کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تدوین میں تخلیق،

تحقیق اور تنقید کے حسین امتزاج سے نہ صرف اردو زبان و ادب کے قدیم سرمائے کو تحفظ فراہم کیا بلکہ جدید اردو زبان و ادب کے لیے بھی راہیں ہموار کیں۔ گو کہ جالبی صاحب سے پہلے بھی قدیم متون کی دریافت اور تدوینی کاوشیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی خدمات لائق تحسین ہیں لیکن ان کے تحقیقی و تدوینی متون پر صحت کے حوالے سے اعتراضات سامنے آتے رہے جب کہ جالبی صاحب درست معلومات کی فراہمی اور ترتیب متن کے عمومی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے تدوینی خدمات مسلم انداز میں سرانجام دیتے دکھائی دیتے ہیں انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نیدستیاب حقائق کو جانچ پرکھ کے بعد ردو قبولیت کا شرف بخشا اور کتب کی تدوین کے وقار میں اضافہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ماہر لسانیات اور لفظ شناس کے روپ میں بھی جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ لسانیات سے اپنی دلچسپی کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"لسانیات سے بھی مجھے گہری دلچسپی ہے، اشتقاق کی تلاش میں ایک لطف آتا ہے، لفظوں کے معنی تلاش کرنے اور متعین کرنے میں مجھے ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔"(25)

جالبی کی مرتب کردہ پہلی لغت "قدیم اردو لغت" پہلی مرتبہ دسمبر 1977ء میں شائع ہوئی جسے مرکزی اردو بورڈ، لاہور کے پلیٹ فارم سے شائع کیا گیا۔ انتساب اپنے استاد محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے نام کیا۔ کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر اشفاق لکھتے ہیں:

"اس لغت کے مطالعے سے یہ بات بھی قاری کے سامنے آئے گی کہ ہمارے اسلاف لفظوں کو کس تلفظ سے ادا کرتے تھے؟ ان کی املاء کیا تھی؟ ان کے اصول وقواعد کیا تھے؟ اور پاکستان کی علاقائی زبانوں نے اردو زبان کی ابتدائی تشکیل میں کیا کردار ادا کیا تھا؟ آپ کو اس لغت میں قدیم اردو کے ہزاروں الفاظ ملیں گے جو آج بھی پاکستان کی علاقائی زبانوں میں زندہ ہیں اور ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔"(26)

لغت کے طریقہ کار کے حوالے سے جالبی صاحب نے لغت کے "پیش لفظ" میں لغت مرتب کرنے کے طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے قارئین، محققین اور لغت نویسوں کے لیے لغت کی تفہیم میں مدد ملے گی۔

جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"اس لغت کو مرتب کرتے وقت میں نے حسب ضرورت مصدر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کر دی ہیں۔ تا کہ قدیم ادب کے مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکل پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ساتھ ساتھ اگر ایک ہی لفظ مختلف املائی شکلوں میں ملا تو اس کی یہ شکلیں بھی شامل کر دی ہیں تا کہ پڑھنے والے کو کسی غلط فہمی یا الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر مختلف مآخذ سے ایک ہی لفظ کے مختلف معانی سامنیلا نے ہیں تو ان سب معانی کو اسی لفظ کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس لغت میں الفاظ کے وہی معنی دیئے گئے ہیں جو قدیم دور میں رائج تھے۔ بہت سے الفاظ کے معنی ایسے ہوں گے جو آج کے معنی سے مختلف مثلاً بانگ کے معنی اذان، جنگی کے معنی سپاہی، البتہ کے معنی یقیناً، ضرور کے معنی بیشک، اڑانی کے معنی پنکھا، اُپرنی کے معنی دوپٹہ وغیرہ۔" (27)

پروفیسر وحید الدین سلیم کے مطابق: اصطلاحیں دراصل اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتی ہیں۔ ایسے مخصوص الفاظ جن پر ماہرین علم و ادب اتفاق کر لیں اور وہ غیر زبان کے الفاظ متعلقہ زبان کا حصہ بن جائیں۔ اردو زبان ایک لچکدار زبان ہے جو اپنے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ کو کسی مہربان میزبان کی مانند سمو لیتی ہے اور اتنی اپنائیت سے جزو بدن بناتی ہے کہ وہ الفاظ اردو زبان کا ہی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اردو میں اصطلاح سازی کی باقاعدہ کوششوں کا سراغ انیسویں صدی کے نصف اول میں ملتا ہے۔

جالبی صاحب نے فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد اول)، (جلد دوم) مرتب کی جسے ادارہ فروغ اردو اسلام آباد نے 1993ء میں شائع کیا، جالبی صاحب نے ابتدا میں "پیش لفظ" کے عنوان سے مقدمہ درج کیا ہے۔ اس مقدمے میں جالبی صاحب فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم کی غرض و غائیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"زوال حیدرآباد دکن کے بعد جب جامعہ عثمانیہ سے اُردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو اصطلاح سازی کا عمل بھی رک گیا۔ دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی اور کم و بیش سارا ذخیرہ نذر آتش ہو گیا۔ جو بچا اسے 1968ء میں آصف ثامن نواب میر، برکت علی مرکم جاہ بہادر کے حوالے کر دیا گیا۔ آج برصغیر میں ایک بھی کتب خانہ ایسا موجود نہیں ہے جہاں یہ سب ذخیرہ موجود ہو۔ اس لیے

میری دلی خواہش تھی کہ اس سے پہلے کہ ان کتابوں کا حصول مشکل یا ناممکن ہوجائے، اصطلاحات کے اس عظیم ذخیرے کو محفوظ کر دیا جائے۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی یہ دونوں جلدیں اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اب اہل علم اصطلاحات کے مطالعے اور رد وقبول کے عمل سے اصطلاح سازی کی اس عظیم روایت کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔"(28)

مذکورہ لغت آپ کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جس کی ضرورت واہمیت وقت کے ساتھ ساتھ روز افزوں بڑھتی جارہی ہے۔ لغت نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن ذولسانی لغت کو مرتب کرنا اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اردو میں ذولسانی لغات کی تدوین کی روایت کم وبیش چار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ 1595ء میں ایک پرتگالی نے پہلا انگریزی لغت مرتب کیا۔ بعدازاں برصغیر پر انگریزی کے دور اقتدار میں بہت سے ذولسانی لغات مرتب کیےگئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لغات دور جدید کے علمی، فکری، معاشی ومعاشرتی شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے قاصر رہیں۔ ذولسانی لغات مرتب کرنے کے لیے لغت نویس کے لیے کم سے کم دو زبانوں کا گہرا علم ہونا لازم ہے۔ جالبی نے یہ لغت جدید ترین سائنسی، معاشی، معاشرتی، فکری، ادبی، علمی اور ثقافتی ضروریات کے تحت تخلیق کی ہے جالبی صاحب "قومی انگریزی اُردو لغت" اور دیگر لغات کے درمیان حد فاضل کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس لغت میں اردو زبان کے لسانی مزاج کے مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کو ملا کر نئے مفاہم نئے معانی اور ان کے لیے نئے رخوں کو ایک واضح صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے اظہار بیان کے نئے پیرائے زبان میں داخل کر دیے گئے ہیں اس لغت میں آپ کو اردو زبان بدلتی، نئے شعور، نئے تصورات اور نئے مفاہیم کو سلیقے سے ادا کرتی محسوس ہوگی۔"(29)

ڈاکٹر جمیل جالبی بلاشبہ اردو زبان وادب کے ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انفرادی شعور اور فکر سے مرصع تھے۔ ان کے تنقیدی نظریات انفرادیت کے حامل تھے انہوں نے" پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ " لکھ کر عملی تنقید کے در وا کیے۔ یہ کتاب 1966ء میں سب سے پہلے لاہور سے زور طبع ہوئی۔ بعد میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے شائع ہوا۔ جب کہ 1987ء میں ڈاکٹر ایاز قادری نے سندھی زبان میں اسے ترجمہ کر کے متعارف کروایا۔ قیام پاکستان کے بعد تنقیدی مباحث کے حوالے سے اسے سب سے پہلی کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اس کتاب کی تکمیل میں ساڑھے تین سال کا عرصہ لگا۔ جالبی صاحب کی اس تخلیقی سرمایہ کے بعد پاکستانی کلچر پر مباحث کا آغاز ہوا۔ مقدمہ شعروشاعری کو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب کہا جاتا ہے۔ جو حالی کا شاہکار ہے۔ اسی طرح تنقید اور تجربہ جالبی صاحب کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1967ء میں شائع ہوئی۔ نئی تنقید کے نام سے جالبی صاحب کے فکری اور تنقیدی مضامین پر مبنی یہ کتاب 1985ء میں پاکستان نیشنل اکادمی کی معاونت سے شائع کی گئی۔ اس کتاب کے بارے میں جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"اس مجموعے میں میں نے کلچر کی سطح پر فکر وادب کے امتزاج اور نئی تنقید اور نئے ادب کے لیے نئے نئے پیمانے اور نئے معیار تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس دور میں جب ہماری تہذیب پارہ پارہ ہو کر بے سمتی کا شکار ہو گئی ہے اور ہم فکری تہذیبی اور تخلیقی سطح پر گہرے بحران میں مبتلا ہیں۔ ہمیں اپنی شناخت کے لیے فکری تہذیبی، تخلیقی تنقیدی بلکہ زندگی کی ہر سطح پر امتزاج کی ضرورت ہے۔"(30)

ہمارے یہاں ادب کے حوالے سے بحرانی کیفیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مولانا الطاف حسین حالی سے لے کر آج تک ہم نے اپنے ادب کو مغرب کے اصولوں کے تحت پرکھا ہے۔ ہمارے سامنے تہذیب وتمدن، کلچر، ادب اور لباس ہر ہر انداز میں مغرب ہی پیمانہ ہے، معیار ہے۔ ہم میں احساس کمتری کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی تہذیب کے معیار کو پرکھنے اور بہتر بناتے ہوئے تخلیقی وفکری شعور کے امتزاج کو بروئے کار لا کر جالبی صاحب کے تنقیدی تصورات کو سمجھنا ہوگا۔ تاکہ ہم اس سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنی تنقید نگاری کے حوالے سے جالبی صاحب رقم طراز ہیں:

"جب میں نے تنقید نگاری کا آغاز کیا تو ایک طرف ان لوگوں کو پڑھا جو بڑی تنقید لکھ رہے تھے جیسے ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈ، سی ڈے لیوس، ہربرٹ ریڈ وغیرہ، ساتھ ہی اپنے اردو لکھنے والے جیسے مجنوں گورکھ پوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، احتشام حسین، اختر حسین رائپوری، حسن عسکری وغیرہ کو بھی ذوق وشوق سے پڑھا۔ ساتھ ہی شبلی، حالی اور آزاد کا بھی مطالعہ کیا۔ جہاں تک ان نقادوں کے اثرات کا تعلق ہے تو میں نے ان کا اثر قبول کیا۔ مگر

اس حد تک جتنا وہ میری طبعیت سے مناسبت رکھتے تھے۔ ایلیٹ مجھے سب سے زیادہ پسند

تھا۔ پھر اثرات کی بات یہ ہے کہ اگر خود آدمی کا تخلیقی وفکری سفر جاری رہے تو ہر پل ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں ایسے میں کسی ایک ادبی شخصیت کا اثر ذہن پر قائم ودائم نہیں رہتا یہ تو اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب ذہن کا سفر رک جائے ایسے میں منظر بھی ٹھہر جاتا ہے۔ اثر کی بات دو اور دو چار کی نہیں ہوتی بلکہ ذہن میں اپنا رنگ چھوڑتے ہیں اور یہ رنگ دوسرے رنگوں اور خود لکھنے والے، سوچنے والے کے ذہن کے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ، ایک نیا روپ بنالیتا ہے اسی سے امتزاج پیدا ہوتا ہے۔"(32)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جالبی صاحب کو مشرق اور مغرب کے ادب سے کتنا گہرا شغف اور وابستگی تھی۔ اور انہوں نے ان کا اثر قبول کیا اور اعتراف بھی کیا ہے۔

جالبی صاحب نے متزاجی تنقید کی ضرورت اور اہمیت پر ہی زور دیا ہے۔ امتزاجی تنقید میں بے باکی اور جرات مندانہ رویہ اختیار کرنا ہی اس کا مقصد اور مدعا ہے۔ لہذا تنقید میں کلچر کے امتزاج کی اہمیت کے پیش نظر جالبی صاحب رقم طراز ہیں:

" کلچر کی سطح پر ہی تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روائتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے اس سے ادب اور ادب پارے کی وضاحت بھی ہوسکتی ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہوسکتا ہے۔ یہی تنقید کی تخلیقی سطح ہے اور یہی تنقید کا منصب ہے۔"(33)

جمیل جالبی صاحب چونکہ محکمہ انکم ٹیکس میں ملازمت کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں ایک مفکر کے طور پر معاشرتی مسائل کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان سے نمٹنے کا حل بھی بتاتے نظر آتے ہیں۔

کسی تحریر یا تصنیف وتالیف کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ بقول نثار احمد قریشی:

" کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے۔ ان کو اپنے الفاظ ومحاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق محسوس نہ ہو۔"(34)

ڈاکٹر حامد بیگ کے مطابق:

" کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔"

(35)

درج بالا تعریفات کی روشنی میں ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس سے گزر کر ایک زبان کا سرمایہ الفاظ و خیالات دوسری زبان میں مدغم ہوتے ہیں۔ اور مترجم دونوں زبانوں کے درمیان ایک حفاظتی پل کا سا مقام رکھتا ہے۔ جالبی صاحب نے بحیثیت مترجم بھی اردو ادب کی خدمت کی ہے آپ بھی ترجمہ نگاری کو نہ صرف ایک فن بلکہ ایک وسیلہ سمجھتے تھے کہ جس سے قوم کے خیالات، معلومات اور جذبات و احساسات کا ذخیرہ الفاظ کے ذریعے دوسری قوم تک منتقل کیا جاتا ہے۔

جالبی صاحب نے ایلیٹ کے مضامین پر مبنی کتاب پہلی مرتبہ اردو اکیڈمی سندھ سے 1959ء میں شائع کی بعد ازاں 1971ء میں مذکورہ کتاب نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن کے ساتھ رائٹر زبک کلب سے شائع ہوئی۔ ٹی ایس ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی اور ایلیٹ کے اثرات قبول کرنے کے حوالے سے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"ان ترجموں سے میں نے اپنے ذہن کی تعمیر کا کام لیا ہے۔ یہ ترجمہ دراصل میرے لیے ریاض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے میں نے ایلیٹ کی فکر اور اس کے طرز ادا کو اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کی ہے۔"(36)

مستند ترجمہ، اچھے ترجمے کی خصوصیات، مترجم کے فرائض و اوصاف سے متعلق جالبی صاحب کی سوچ اور فکر و تنقیدی شعور کو واضح سمت ملتی ہے کیونکہ ترجمہ جب ایک زبان کے قالب سے دوسری زبان کے قالب میں ڈھلتا ہے تو وہ محض ترجمہ اور لفاظی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ وہ ایک پورے معاشرے اور حالات و واقعات کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور اخلاقی تصویر ہوتی ہے۔ مترجم کا یہ فرض ہے کہ ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو اور اس میں مصنف کا ذاتی اسلوب بھی جھلکتا ہو۔ بلاشبہ جالبی صاحب ایک محقق اور ادبی سائنس دان کی حیثیت سے ادب کی جملہ اصناف میں کامیاب تجربات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُنہوں نے ایلیٹ کے مضامین، ارسطو سے ایلیٹ تک، برصغیر میں اسلامی جدیدیت اور برصغیر میں اسلامی کلچر جیسی اہم کتب سے اردو ادب کا کینوس مزین کر دیا جو ادبی سرمائے میں اضافہ کا باعث بنیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی "ایلیٹ کے مضامین" کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحسین میں

لکھتے ہیں کہ:

"ایلیٹ تنقید کی ایک سطح ہے جس تک ہمارے نقادوں میں وہی پہنچ سکے ہیں اور ان کا ترجمہ اتنا قدرتی، رواں اور انفرادی ہے کہ اسے اصل تصنیف کہنا چاہیئے ۔ پڑھنے والوں کو جدید ترین تنقید کی سطح پر ہونے میں پوری مدد کرتا ہے۔ اور اس سطح پر جو مسائل سامنے آتے ہیں ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہر ادبی اور تنقیدی مسئلے پر نہ صرف ضروری معلومات سامنے آتی ہیں بلکہ ان پر ایک زاویہ نظر بھی ملتا ہے۔ جو پڑھنے والے کی نظر کو متاثر ضرور کرتا ہے۔ اسی طرح تنقیدی شعور پیدا کرنے میں یہ تصنیف ایک خاص درس بہم پہنچاتی ہے۔"(37)

جالبی صاحب کی ترجمہ شدہ دوسری کتاب کا موضوع "ارسطو سے ایلیٹ تک" ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1975ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کی اس کتاب کے کم وبیش آٹھ ایڈیشن مختلف اداروں نے شائع کیے۔ پروفیسر نظیر صدیقی مذکورہ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر رائے دیتے ہیں:

"ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "ارسطو سے ایلیٹ تک" اپنے تراجم اور مغربی نقادوں کے تنقیدی تعارف کی بنیاد پر اردو کی تنقیدی کوششوں میں قدر اول کی چیز ہے۔ تنقید کا طالب علم اردو میں جتنا کچھ اس کتاب سے سیکھ سکتا ہے اتنا کسی اور کتاب سے نہیں سیکھ سکتا۔ یہ کتاب نہ صرف مغرب کے تنقیدی نظریات سے بھرپور واقفیت بہم پہنچاتی ہے بلکہ مغربی تنقید کے بنیادی مسائل سے بھی آشنا کرتی ہے۔"(38)

جالبی صاحب کی ایک اہم تخلیق "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے جو کہ عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ پہلی بار 1969ء میں چھپی ڈاکٹر عزیز احمد اپنی زندگی میں دلی خواہش کا اظہار کر چکے تھے کہ ان کی اس کتاب کا ترجمہ ہونا چاہیئے ۔ زندگی نے وفا نہ کی اور ان کے انتقال کے بعد جمیل جالبی نے ان کی دونوں کتب برصغیر میں اسلامی کلچر اور برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے مسودے تیار کیے۔ ان تراجم کے حوالے سے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"ہمیں ذہنی، فکری سطح پر اپنے زندہ مسائل کے حوالے سے ایسی کتابوں اور ایسے ہی مطالعوں کی ضرورت ہے تا کہ ہم زندگی اور معاشرے کو آگے بڑھنے والی سوچ کی طرف مائل کر سکیں۔ اور فکر نو کا سورج، بادلوں کی اوٹ سے طلوع ہو سکے۔ آپ اس کتاب سے اتفاق کریں یا اختلاف، اپنی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کی طرف مائل ضرور کرتی ہے۔"(39)

عزیز احمد کی کتاب

''Islamic modernism in India and Pakistan''

کو "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ 1989ء میں اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔ جب کہ بھارت سے یہ کتاب "ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت" کے عنوان سے دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے 1990ء میں چھپی۔

پروفیسر عقیل احمد "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" میں جالبی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں: "عزیز احمد نے اس تصنیف میں 1857ء کے بعد تمام اہم مفکرین کے مذہبی اور سیاسی افکار کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اور اس موضوع سے دل چسپی لینے والوں کے لیے اس عہد کے بر عظیم کی اسلامی فکر کا تجزیہ اہمیت کا حامل ہے۔ افکار و خیالات کا مطالعہ براہ راست اور اصل بنیادی مآخذ کے ذریعے کیا ہے۔ اور موضوع بحث سے متعلق تمام متعلقہ امدادی مآخذ پیش نظر رکھے ہیں۔ افسوس کسی اور پاکستانی مصنف نے اس موضوع کا خصوصی مستقل مطالعہ نہیں کیا۔"(40)

ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمے کے فن سے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہو کر سامنے آئے ہیں۔ ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے تو ترجمہ نگاری بھی تخلیقیت کے تقاضے پورے کر کے ہی معراج کو پہنچتی ہے۔ اور مترجم کی ذات تخلیق کاری کے ساتھ ساتھ اپنے انفرادی اسلوب کے زیر سایہ فن پارے کی وقعت وعظمت میں اضافہ کرتی ہے۔ آپ ذو لسانی الفاظ وتراکیب اور تراجم کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری میں مصنف کے لہجے، اسلوب بیان کو اہم عناصر گردانتے ہیں۔ لہذا جالبی صاحب کی تحاریر ہمارے سامنے تخلیق نو کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں اور قاری تخلیق کے داخلی و خارجی پہلوؤں کے سنگ سنگ سفر کرتے ہوئے مشرقی و مغربی تہذیب اور زبان و بیان کے چٹخارے لینے لگتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم مغربی تنقیدی نظریات کو اردو ادب میں متعارف کروانے کے لیے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور مذکورہ کتب کے تراجم جالبی صاحب کے ترجمہ نگاری کے نظریات کی عملی و نظری صورتیں ہیں۔ پروفیسر سجاد لکھتے ہیں:

"ترجمے سے اعلیٰ قسم وہ ہے جسے تخلیقی ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل ایک زبان میں کہی گئی بات کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کا نام ہے کہ ترجمہ "تخلیق نو" کی صورت اختیار کرے۔ اردو میں اس روایت کو فروغ دینے والے مترجمین میں محمد حسن عسکری ایک خصوصی اہمیت کے حامل

مترجم تھے۔ مادام بواری اور گڈ بانی ٹو برسن میں عسکری نے نہایت عمدگی سے مغربی ادب کے ان شاہکار وں کی اردو میں "تخلیق نو" کا قابل ستائش اور لائق تقلید کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جالبی صاحب نے اپنے ترجموں کے ذریعے عسکری کی اس روایت میں اضافہ کیا ہے۔"(41)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا شمار ایسے ادبا اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو نونہالوں کو ملک وقوم کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جیسے تناور درخت کے لیے اچھے بیج کا بونا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح ننھے بچوں کی ذہنی پرورش اور ذہنی آسودگی کے لیے نصیحت اور سبق آموز ادب کی تخلیق بھی ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ تاکہ درست سمت میں بچوں کی راہنمائی کی جاسکے۔ جالبی صاحب نے اردو زبان وادب کی تاریخ اور دیگر تنقیدی کتب کی تخلیق سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے عظیم خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ بہت مصروفیت میں بھی بچوں کے ادب کے لیے وقت نکالا۔ بچوں کی دلچسپی کیمطابق ادب کی تخلیق مشکل ہے بلکہ موضوعات کا انتخاب اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے لیکن جالبی صاحب نے یہ کارنامہ بھی بالآخر سر انجام دے دیا اور ان کی کہانیاں "بلیاں" کے عنوان سے مولانا رزاق الخیری کے رسالے "بنات" میں شائع ہوتی رہیں۔ اور پھر "حیرت ناک کہانیاں " کے عنوان سے ایک طویل قصہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی 1983ء میں شائع کیا بچوں کے لیے جالبی صاحب نے جارج آرول کے ناول کا ترجمہ "جانور ستان" کے نام سے کیا۔ جسے مکتبہ نیا دور کراچی نے 1958ء میں شائع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا پہلا مزاحیہ ناول "فسانہ آزاد" کے مزاحیہ کردار "خوجی" سے بچوں کو متعارف کروانے کا سہرا بھی جالبی صاحب کے سر ہے۔ "خوجی پر کیا گزری" شروع کیا اور اسی سلسلے کا ذیلی عنوان "نہ ہوئی قرولی" کو بنایا گیا۔ جالبی صاحب نے بچوں کی ذہنی استعداد، عمر، دلچسپی اور حجانات کے مطابق ادب تخلیق کیا۔ بچے مافوق الفطرت عناصر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اس لیے انہوں نے مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ ساتھ جانوروں کو کرداروں کی صورت میں پیش کر کے تربیتی کہانیاں تخلیق کیں۔ جن کا مقصد بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت کرنا تھا۔ ڈاکٹر محمود الرحمن جمیل جالبی کے اسلوب کے متعلق رائے دیتے ہیں:

"وہ نہ کہیں ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، نہ ہی محاورات کی بھرمار کرتے ہیں، نہ طویل جملہ لکھنے کے عادی ہیں اور نہ ہی عبارت کو گنجلک کر دینے کے خوگر ہیں۔ وہ بچہ بن کر بچوں کی زبان

بولتے ہیں۔سیدھے سادے انداز میں اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں جو ننھے دلوں میں اترتی چلی جاتی تھے۔ پڑھنے والے بچوں کو اس کا ذرا سا بھی شائبہ پیدا نہیں ہوتا۔کہ ان سے مخاطب ایک ایسا شخص ہے جو اپنے وسعت معلومات اور بلند فہم ادراک کی بدولت پورے برصغیر میں ایک قد آور ادیب اور محقق کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔"(42)

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد جمیل خان جنہیں ادبی دنیا ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔مشہور صحافی سید جالب دہلوی کی غیر معمولی شہرت کے باعث انہیں اپنا آئیڈیل تصور کرتے تھے۔اسی نسبت سے جالبی لکھنے لگے اور یہی نام وجہ تسمیہ بن گیا۔اردو زبان وادب سے عشق کو ایک فرض عبادت کی مانند نبھایا۔اجتماعی کاوشوں کو انفرادی کاوش پر موقوف کرتے ہوئے جوئے شیر لانے کے مترادف ادبی وتخلیقی سرگرمیوں میں محنت شاقہ سے کام لے کر اردو زبان وادب کی پیش بہا خدمت کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں "ہلال امتیاز"،"ستارہ امتیاز"،"مولوی عبدالحق ایوارڈ ا"ور اردو ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ" کمال فن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔آپ ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔اردو ادب کی تمام اصناف میں ان کی سنجیدہ علم ودوستی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کے ارتقاء میں نہ صرف ایک مشعل بردار کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو زبان و ادب کے محسن ہیں۔جن پر اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ نازاں رہے گی۔اور جالبی صاحب اپنی نادر و نایاب تخلیقی خدمات کی بدولت تاابد اردو ادب کے ماتھے کا جھومر بن کر چمکتے رہیں گے۔

میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

حوالہ جات

1۔" کچھ جمیل جالبی کے بارے میں"،از مشرف احمد،مشمولہ،"ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،مرتبہ گوہر نوشاہی،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،باراوّل،1993ء،ص18

2۔" کچھ جمیل جالبی کے بارے میں"،از ڈاکٹر خلیق انجم،مشمولہ،"ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،مرتبہ

گوہر نوشاہی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، باراوّل، 1993ء، ص19
3۔انٹرویو، ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو، ڈاکٹر مشرف احمد، مشمولہ، سہ ماہی "ارمغان"، (جمیل جالبی نمبر) " کراچی، اپریل، مئی، جون 1996ء، ص154۔
4۔سہ ماہی "سفیر اردو (جمیل جالبی نمبر)" لیوٹن: اکتوبر نومبر دسمبر (یو کے)، 2004، ص6
5۔عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، "ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن"، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان 2007ء، ص13
6۔سہ ماہی "ارمغان"، ایضاً، ص168
7۔ایضًا، ص168
8۔نذر الحسن صدیقی، "روشنی سراپا"، مشمولہ، "ارمغان"، ایضًا، ص31۔30
9۔مشرف احمد، ڈاکٹر، "جالبی صاحب"، مشمولہ، "ارمغان"، ایضًا، ص55
10۔شاہد احمد دہلوی، "جمیل جالبی"، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، ایضًا، ص77، 78
11۔انور عالم صدیقی، "میرا ہم جماعت"، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، ایضًا، ص46، 47
12۔بیگم نسیم شاہین، "ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں "، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ایضًا، ص 149
13-انٹرویو، محترمہ رضوانہ نسیم صاحبہ، بمقام، اردو ڈکشنری بورڈ کراچی، بتاریخ 3 اکتوبر، 2007ء
14-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ' 'تاریخ ادب اردو ' '، (جلد دوم)، طباعت ششم، مجلس ترقی ادب، لاہور 2009ء، ص11-12
15-An Introduction to the study of ''William Henery Hydsan, literature.2nd edition,George G.Hamp Co.P.36
16-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ' 'تاریخ ادب اُردو ' '، (جلد دوم)، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع سوم، 1994ء، ص12
17-تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اُردو" (ابتدا سے 1857 تک)، ایضًا، ص11
18-جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو"، (جلد دوم)، ایضًا، ص13

19-سیدہ جعفر،گیان چند جین،ڈاکٹر، ''اُردو کی ادبی تاریخیں ''،انجمن ترقی اُردو، پاکستان، 2000ء،ص 21

20-"فرہنگ عامرہ" (عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی لغت)، محمد عبداللہ خان خویشگی

21-"اُردو لغت"، اُردو ڈکشنری بورڈ کراچی، جلد پنجم

22-گیان چند جین، ڈاکٹر، "تحقیق کا فن"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2002ء، ص 398

23-ایضًا

24-"دیوان حسن شوقی"، مرتبہ، جمیل جالبی، ایضًا، کراچی، ص 1

25-"دیوان نصرتی"، مرتبہ، جمیل جالبی، قوسین، لاہور، 1972ء، ص 7

26-مثنوی" کدم راؤ، پدم راؤ"، مرتبہ: جمیل جالبی، ایضًا، ص 36

27-رشید امجد، ڈاکٹر، "میراجی پر دو اہم کتابیں"، مشمولہ، جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ایضًا، ص 230

28-"اُردو تحقیق کی روایت"، ایک مصاحبہ (گوہر نوشاہی، ڈاکٹر جمیل جالبی)، مشمولہ، "ادبی تحقیق"، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب لاہور، 1994ء، ص 36

29-اشفاق احمد، تعارف، مشمولہ، "قدیم اردو کی لغت"، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، باب اوّل، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، دسمبر 1973ء

30-جمیل جالبی، ڈاکٹر، "قدیم اُردو کی لغت"، (پیش لفظ)، ایضًا، ص 8

31-"فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، (جلد دوم)"، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1993ء، پیش لفظ، ص ج

32-"قومی انگریزی اردو لغت"، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، طبع اول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992ء، ص 6-7

33-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''نئی تنقید''، مرتبہ، خاور جمیل، کراچی، رائل بک کمپنی 1985ء، اشاعت اول، ص 10

34-انٹرویو پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ، ایضًا، ص 172

35-جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تنقید اور تجربہ"، کراچی، مشتاق بک ڈپو، بار اول، 1967ء، ص 8

36-احمد فخری حاجی، "دور تراجم"، مشمولہ، "ترجمے کا فن اور روایت"، مرتبہ، نثار احمد قریشی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر 1985ء، ص40-41

37-حامد بیگ مرزا، ڈاکٹر، "ترجمے کا فن"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مئی 1988ء، ص5

38-جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ایلیٹ کے مضامین"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء، ص38

39-محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ' 'ارسطو سے ایلیٹ ' 'مشمولہ، ' 'ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ "، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، انڈیا، باراول، 1993ء، ص420

40-نظیر صدیقی، ' 'ڈاکٹر جمیل جالبی، ایک ممتاز مترجم ' 'مشمولہ، ' 'ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ "، ایضاً، ص403

41-جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مترجم)، "برصغیر میں اسلامی کلچر"، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1990ء، ص 11-10

42-معین الدین عقیل، ڈاکٹر، "عزیز احمد پاکستان میں تاریخ نویسی کی منفرد مثال" مشمولہ، جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان 1986، جلد5، ص104

43-سجاد شیخ، "اعلیٰ ترجمے کی دو مثالیں"، مشمولہ، "جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، ایضاً، ص406

44-محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، "ڈاکٹر جمیل جالبی بچوں کے ادیب"، مشمولہ "جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، از گوہر نوشاہی، ایضاً، ص: 44

☆☆☆